استاذ الشعراء مولانا سید محمد کاظم جاوید آجتہادی

پدم شری جناب مہذب لکھنوی مرحوم

خلق سے اُٹھ کر وفا کا نام زندہ کر گئے
زندۂ جاوید ہیں جو راہِ حق میں مر گئے

مرحوم کا نام سید محمد کاظم صاحب آپ کے پدر محترم مولانا سید محمد جعفر صاحب امیدؔ ابن صفوۃ العلماء مولانا سید محمد باقر صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ ابن سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب رضوانمآبؒ ابن غفران مآبؒ مولانا سید دلدار علی صاحب طاب ثراہ تھے۔ آپ بہ حیثیت کمالِ فن شعر و شاعری خاندان اجتہاد کی بہت نمایاں فرد تھے۔ آپ کا عرف بندے کاظم صاحب تھا۔
آپ کا انتقال ۱۴؍ربیع الاول ۱۳۴۰ھ کو ہوا اور جناب غفران مآب علیہ الرحمہ کے امام باڑے میں دفن ہوئے۔
شاگردوں کی مختصر فہرست (بازار سخن) سلسلہ کی چھٹی قسط میں پیش کی جا چکی ہے۔ مکمل فہرست کا بار مختصر صفحات اٹھانے کو تیار نہیں بس اس قدر کافی ہے کہ آپ مسلّم الثبوت استاد تھے۔
آپ کے بعد بعض شاگرد بھی صاحب فن و صاحب تلامذہ گذرے ہیں۔ مثلاً جناب سید مجاور حسین صاحب تمناؔ مرحوم اور لڈن صاحب بہارؔ مرحوم وغیرہما۔
آپ کے بکثرت مراثی موجود ہیں۔ جو مصنف مرحوم کی خوش نصیبی سے عالی جناب سید سرفراز علی خان صاحب شاکرؔ رئیس جانسٹھ ضلع مظفر نگر تک پہنچ گئے اور نواب صاحب موصوف نے اپنی ادب دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے نہایت سلیقے سے مرثیے صاف کرا کے دو جلدوں میں تقسیم فرمائے ہیں۔
اس میں کلام نہیں کہ حضرت جاویدؔ انتہائی زود گو اور پُر گو شاعر تھے، اصناف سخن پر قدرت حاصل تھی۔ آپ کے چند غزلیات انجمن محافظ اردو نے (بازار سخن) میں شائع کئے ہیں۔ آپ کا مکمل دیوان خدا معلوم کہاں ہے اور کس شاعر کو شعر گوئی کی زحمت سے محفوظ کئے ہوئے ہے۔
رباعیات و سلام کا بھی پتہ نہیں۔
آپ کے مراثی میں تغزل کا کافی ذخیرہ ہے۔ زبان بہت نرم، محاورات میں بکثرت روزمرّہ کے دریا بہائے ہیں۔
تخئیل کی نزاکت آپ کا حصہ تھی۔
جدید مضامین کی پیداوار آپ کا فطری جوہر تھی۔
آپ کی خوانندگی نہایت سادہ تھی مگر ایک کیف تھا۔ شہر لکھنؤ کے علاوہ اصغر آباد، حیدر آباد، پٹنہ اور دیگر مقامات میں بھی آپ تشریف لے جاتے تھے اور کامیاب مجلسیں پڑھ کے واپس ہوتے تھے جن کا سکہ اب تک دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔
خداوند عالم مرحوم کو غریق رحمت فرمائے اور جوار سید الشہداء میں جگہ کرامت فرمائے۔

(مورخہ ۲۵؍جون ۱۹۵۲ء)

مرثیہ درحال ہم شبیہ پیغمبر حضرت علی اکبر علیہ السلام (۸۸ ربند) جاوید اجتہادی

کون دنیا میں نہیں آج ثنا خواں میرا
بس کے جو دل میں رہے وہ نہیں ارماں میرا
دہر کی تیز ہوا سے نہیں نقصاں میرا
منھ چھپا لے گا چراغِ تہ داماں میرا
سوز غم بھی سبب کار نمایاں ہوجائے
یوں نفس ہوں تہ و بالا کہ چراغاں ہوجائے

میں وہ ہوں جس کو نہ اچھے نہ برے کی پروا
کون سی جا پہ نہیں نظم کا میری چرچا
میرے سایہ کو یہ دعویٰ ہے کہ میں ہوں یکتا
بارہا مہر جہاں تاب نے کی کسب ضیا
بارور پھر نہ ہو کس طرح یہ گلشن میرا
سو شعاعوں کے ہیں ہاتھ ایک ہے دامن میرا

سچ ہے قسمت پہ جو بنتی ہے بگڑ جاتی ہے خو
گردش چشم ہوئی اور نکل آئے آنسو
دل تڑپنے کے بتا دیتا ہے سو سو پہلو
اب یہ رونا ہے کہ ضائع کیا کیوں دل کا لہو
نئے صدموں نے جہاں سے مجھے کھو رکھا ہے
انھیں اشکوں کے تو دریا نے ڈبو رکھا ہے

حسرتیں لے کے ابھی آئیں گے آنے والے
نقش باطل مجھے سمجھے تھے مٹانے والے
دوست رکھتے ہیں مجھے میرے گھرانے والے
آفتاب اب مجھے کہتے ہیں زمانے والے
چاندنی چار ہی دن کی صفتِ بدر ہوئی
جب زوال آگیا مجھ پر تو مری قدر ہوئی

اب تو آنکھوں کی طرح دے چکے اعضا بھی جواب
دل لہو ہوتا ہے جب سے نظر آتے ہیں وہ خواب
کوئی دے دیتا ہے فردوسیؔ و طوسیؔ کا خطاب
کوئی مردوں میں ملاتا ہے یہ مٹی ہے خراب
نقش کی پاؤں سے جب دشت میں زنجیر ملی
میں یہ سمجھا کہ مرے خواب کی تعبیر ملی

میرے راتوں کے تڑپنے کو نہ پوچھیں احباب
غیظ سے چیں بجبیں ہوگیا تھا بستر خواب
میں تڑپنے میں جو ٹھہرا تو ہوا دل بیتاب
استخواں دے رہے تھے ٹوٹ کے نالوں کا جواب
کسی بسمل کو خبر تھی نہ کسی بسمل کی
ہچکی آنے سے رگیں ٹوٹ گئی تھیں دل کی

نیند جن میں نہیں آئی وہی راتیں ہیں گواہ
آبلے دیکھ کے جلنے لگے تھے تار نگاہ
تیرہ و تار مکاں وہ تھا کہ خالق کی پناہ
مختصر یہ نہ ملی نیند کو آنکھوں میں بھی راہ
گرمیٔ آبلۂ دل سے میں شرماتا تھا
آگ پانی سے لگی تھی تو جلا جاتا تھا

جمع اسباب مصیبت کے تھے کاشانے میں
درد کو فائدہ کیا تھا مرے تڑپانے میں
فرق ظاہر تھا نہ جینے میں نہ مرجانے میں
شمع اندھوں کی طرح آئی سیہ خانے میں
داغ دل کی بھی ضیا سے مجھے شرم آتی تھی
خیر اسی روشنی میں رات تو کٹ جاتی تھی

مجھ کو مرنا نہیں جینے سے زیادہ مشکل
اس سے فرمائشیں کیوں، رحم کے جو ہو قابل
یوں تڑپتا ہوں کہ جس طرح سے تڑپے بسمل
ہاں ذرا گور غریباں میں بہل جاتا ہے دل
حسرتیں دستِ تاسف کو ملا کرتی ہیں
باتیں قبروں کی خموشی سے ہوا کرتی ہیں

کوئی دم بھی نہیں صدموں سے مجھے اب تو فراغ
اب نہ پہلے سے خیالات نہ پہلا سا دماغ
مدتوں سے جو خزاں دیدہ ہے یہ ہے وہی باغ
ان ہی قبروں پہ جلا کرتے ہیں داغوں کے چراغ
آہیں بھرنے کی حقیقت نہ بتائیں ان سے
دور ہیں ان کے نفس کی بھی ہوائیں ان سے

قبریں دیکھیں کہیں دو چار کسی جا پہ ہزار
بیکسی روتی تھی ان پر کہ جو کہنہ تھے مزار
بیٹھ جانے میں نہ راحت تھی نہ اُٹھنے میں قرار
سو جگہ قبر شکستہ پہ ہوا قلب فگار
میری آواز وہاں تک جو نہیں جاتی تھی
چادر قبر کے پھولوں کو ہنسی آتی تھی

اب کوئی دوست نہیں مونس و غمخوار نہیں
بیکسی کہتی ہے کوئی بھی طرفدار نہیں
قبر کی سیر ہر اک طبع پہ کیا بار نہیں
چار دیواروں میں گھر کی کوئی دیوار نہیں
لاکھ دو لاکھ نہیں ان کے برابر قبریں
ایک جنگل میں نظر آئیں بہتّر قبریں

دھوپ کو دیکھ کے ہر ایک شجر جلتا ہے
شمع کی طرح سے ہر داغِ جگر جلتا ہے
یہ چراغ ایسا ہے جو شام و سحر جلتا ہے
دیکھ لینے سے بھی دامانِ نظر جلتا ہے
سو زبانوں سے بصد قلب حزیں کہتی تھی
قبریں پیاسوں کی یہ ہیں واں کی زمیں کہتی تھی

کربلا میں یہ عجب باغ ہوا تھا پامال
آج کیا حشر تلک جس کی ملے گی نہ مثال
کب میسر ہوئیں معلوم ہے قبروں کا بھی حال
پہلے بے دفن رہی احمدؐ مختار کی آل
پھر یہ رونا تھا کہ قسمت نے دکھائیں قبریں
ایک بیمار نے مشکل سے بنائیں قبریں

ایک شب کیا کئی راتوں کا ہر اک تھا جاگا
دوپہر تک کوئی سویا کوئی پہلے سویا
سب نمازیں جو ادا ہو چکیں تب آئی قضا
آپ تھے حجت حق اس سے تحمل تھا سوا
قرب کی جس کے تمنا تھی اسے پا ہی گئی
عصر کی پڑھ کے نماز آپ کو نیند آ ہی گئی

ذکر اب اس کا ہے جس سے تھا وفاؤں کا رواج
کون، وہ جس کی سخاوت کا زمانہ محتاج
بعد معصوم کے ہر اک کا وہی تھا سرتاج
اُن ہی شیروں میں وہ اک شیر تھا محرور مزاج
خون کو ڈھونڈھ کے بھی گرم زمیں پا نہ سکی
بے ترائی کی ہوا کے جسے نیند آ نہ سکی

صبح عاشور سے دو بچوں پہ ہے آمد خواب
ایک کی ایک نظیر، ایک کا ہے ایک جواب
مرتے مرتے بھی گیا ماں کا نہ داب و آداب
جن کے بچپن کو کہیں دور پہ روتا ہے شباب
نہ محل تھا کہیں سونے کا مگر یہ سوئے
ماں کی تقدیر اُدھر سوئی اِدھر یہ سوئے

حال بے شیر کے سونے کا سُنیں اہل عزا
نفسِ سرد بھرا کرتی ہے جنگل کی ہوا
شہ کا دل چھد گیا سوکھا سا گلا ان کا چھدا
ہاتھ پر باپ کے یہ تھے کہ لگا تیر قضا
کھینچ کر دشت پُر آفت میں اجل لائی اُسے
کانپتے ہاتھوں کے گہوارے میں نیند آئی اُسے

اک جواں کے بھی ذرا خواب کا سنیئے مذکور
نیند عالم میں جوانی کی بہت ہے مشہور
ایک مدت سے سفر میں ہیں شہنشاہ غیور
نوم خاص آپ پہ تھا رخش پہ تھے گو کہ حضور
ہوئے بیدار تو کچھ اور خیال آنے لگے
یاس میں کلمۂ ترجیع یہ فرمانے لگے

علی اکبرؑ کے سوا اور تھی یہ کس کی مجال
حجت حق سے جو اس وقت میں کچھ پوچھتا حال
شہ نے اس وقت میں فرمایا سنا جب یہ سوال
اس سفر میں ہے اجل ساتھ یہ آیا تھا خیال
کہا فرزند سے کچھ آپ کہیں گے کہ نہیں
کہا یہ کہیئے کہ ہم حق پہ رہیں گے کہ نہیں

کہا ہر طرح سے تم حق پہ ہو اے نیک خصال
کہا پھر کہیئے قضا آگے چلے کیا ہے ملال
موت اور ہم کو ڈرائے نہیں اس کی یہ مجال
کہیں دبتے ہیں کسی سے اسد اللہ کے لال
صبح عاشور کوئی چیز نہ بھائی ان کو
نام ہے جس کا اجل نیند وہ آئی ان کو

علی اکبرؑ کا ہے یہ حال کہ مضطر ہیں کمال
مانع عرض ہے پر رعب شہ نیک خصال
غم میں بھائی کے دل شاہ کا ہے غیر جو حال
پئے رخصت کہیں اکبرؑ یہ نہیں ان کی مجال
دل سے افسانۂ اندوہ کو کہہ جاتے ہیں
رُخِ سرور کو ابھی دیکھ کے رہ جاتے ہیں

شہ سے کہتے ہیں تعجب کا ہے بابا یہ مقام
نہ کرے صبر مجھے کون امام ابن امام
آپ کو مرضیٔ خلاق دو عالم سے ہے کام
جان آجائے اگر شہ پہ تصدق ہو غلام
یوں تو فرزند ہوں صابر کا نہ گھبراؤں گا
تر پسینے میں ہوں جنت کی ہوا کھاؤں گا

حال کس سے کہوں عمّو سا دلاور بھی نہیں
لائق مدح جو ہوں مجھ میں وہ جوہر بھی نہیں
میں کسی طرح سے عباسؑ سے بہتر بھی نہیں
وہ تو وہ ان کے غلاموں کے برابر بھی نہیں
جس کی کوئی بھی حقیقت نہیں وہ ادنیٰ ہوں
جب کیا آپ نے صبر ان کو تو پھر میں کیا ہوں

قتل جو ہوگئے وہ لوگ تھے ہاں قابل غم
یوں بھی تو کم نہ ہوا کچھ یرش اہل ستم
جوہر صبر کھلیں ہو نہ اگر چشم بھی نم
رنج عمّو کا مرے غم سے زیادہ ہے کہ کم
شہ نے فرمایا کہ پھر جانِ حزیں کھوئیں گے
اس ضعیفی میں جواں لال کو بھی روئیں گے

تم کو یہ جوش کہ اس فوج سے ڈرنا کیا ہے
خلعتِ سرخ ہے اک خون میں بھرنا کیا ہے
کھیل اک یہ بھی ہے دنیا سے گذرنا کیا ہے
تم سمجھتے ہو جوانی ہے تو مرنا کیا ہے
پوچھے تکلیف اجل کوئی جواں کے دل سے
دم بھی کھنچ کھنچ کے نکلتا ہے بڑی مشکل سے

خیر جو دل میں ہے کچھ ہوش میں آلیں تو کہیں
پھر دوبارہ بھی کلیجے سے لگا لیں تو کہیں
آپ میدان بلا خیز میں جا لیں تو کہیں
اپنی حالت کو ذرا لاش اٹھا لیں تو کہیں
دل کی پژمردہ کلی اب نہیں کھلنے کے لئے
ہم نے پالا تھا تمہیں خاک میں ملنے کے لئے

میری مرضی کو بھی اللہ کی طاعت سمجھو
سب کا دل رکھنے کو بھی اجر شہادت سمجھو
دل بیتاب کی اک اک کے حقیقت سمجھو
دے دیں زینبؑ جو اجازت تو غنیمت سمجھو
شدت درد دل و درد جگر دیکھ تو لیں
گھر میں ہو آؤ کہ سب ایک نظر دیکھ تو لیں

اشک آنکھوں میں جو اس شیر کے کچھ بھر آئے
پاس روتے ہوئے کس درد سے سرور آئے
گھر میں بھی بعد اجازت علی اکبرؑ آئے
سب سے پہلے یہ سوئے زینبؑ مضطر آئے
رعب یہ تھا کہ نگہ نیچی تھی منھ موڑے تھے
عرض کی تاب نہ تھی دست ادب جوڑے تھے

ماں سے کی عرض کہ اماں ہمیں رخصت نہ ملی
شہؑ سے مر جانے کی خادم کو اجازت نہ ملی
گھر میں آنے کی بھی تقدیر سے فرصت نہ ملی
سب کو تو مل گئی ہم کو رَہ جنت نہ ملی
اب کوئی کام نہیں گر ہے تو بس کام یہ ہے
ہم گلا کاٹ کے مر جائیں گے انجام یہ ہے

چھپ کے بیٹھوں کسی گوشے میں یہی ہے آہنگ
واں کا کچھ اور ہے انداز یہاں اور ہے رنگ
ولولہ اب ہے لڑائی کا نہ میداں کی امنگ
کہا بانو نے کہ پھر کیوں نہیں جاتے پئے جنگ
کارگر آج نہ تدبیر نہ تقدیر ہوئی
کیوں نہ میں روؤں کہ لاش آنے میں تاخیر ہوئی

سب کی جو مالک و مختار ہیں لو ان سے رضا
حق کسی کا نہیں یہ حضرت زینبؑ کے سوا
واسطہ حقِ شہ دیں کا جو اکبرؑ نے دیا
رو کے زینبؑ نے کہا خیر سدھارو بیٹا
اک بہانہ ہوا مُنھ آنسوؤں سے دھونے لگیں
تھام کر گوشۂ دامان قبا رونے لگیں

غل جو رونے کا سنا چونک پڑے عابدؑ زار
سوئے اکبرؑ چلے بستر سے تڑپ کر اک بار
دو قدم راہ کا چلنا بھی ہوا تھا دشوار
پاس آ کر کہا اکبرؑ سے کہ بھائی ہو نثار
خلد کے شوق کی یہ حد ہے کہ منھ موڑ چلے
تازیانوں کے لئے تم بھی ہمیں چھوڑ چلے

تاب دل کو نہ رہی رو دئے خود آخرکار
دوڑے اکبرؑ جو گلے ملنے تو یہ کی گفتار
زندگی فرط غم و رنج سے اب ہے بیکار
استخواں جل کے بتاتے ہیں کہ اتنا ہے بخار
یہ قدم ہائے نہیں سوئے جناں اُٹھتا ہے
دل میں وہ آگ لگی ہے کہ دھواں اُٹھتا ہے

کہا اکبرؑ نے گلے سے تو ملوں گا میں ضرور
قابل غور کہیں ہوتے ہیں آپس کے اُمور
کہا بہتر ہے وہ سینہ رہے اس سینہ سے دور
کہا اکبرؑ نے کہ یہ بات نہ فرمائیں حضور
تن بیجاں میں اسی ملنے سے جاں آئے گی
دل کی ٹھنڈک سے مری پیاس بھی بجھ جائے گی

ہاں مگر آخری ہے ایک وصیت بھائی
پائینتی قبر شہ دیں کے ہو تربت بھائی
کم کسی وقت میں کب ہوگی محبت بھائی
یاد رکھئے گا مری پیاس کی شدت بھائی
ہو میسر کبھی پانی تو اسے پیجئے گا
کچھ بچے گا تو لحد پر وہ چھڑک دیجئے گا

باہیں ڈالیں جو گلے میں تو ہوا جوش بکا
علی اکبرؑ سے کہا کھول دو اب بند قبا
مجھ کو اس سینہ سے اک کام ہے میں تم پہ فدا
منھ کو جب مل چکے دوبار تو یہ رو کے کہا
آڑ میں ڈھال کی ہر وقت چھپائے رہنا
بھائی اس سینے کو برچھی سے بچائے رہنا

مرض و غم جو بڑھے غیر ہوا دونوں کا حال
قابل غور نہیں ہے وہ جواب اور وہ سوال
علی اکبرؑ نے یہ کی عرض بصد رنج و ملال
بوسے شانوں کے میں لے لوں کہ تمنا ہے کمال
خیر حافظ ہے خدا آپ جہاں ہوں بھائی
کیا عجب گر یہیں رسّی کے نشاں ہوں بھائی

اس قدر روئے کہ عابدؑ کا عجب حال ہوا
منھ سے دو بار خدا حافظ و ناصر تو کہا
علی اکبرؑ کا کوئی روکنے والا نہ رہا
غش نے بیمار کے دے دی انھیں مرنے کی رضا
ذکر رخصت کا بھی کچھ چھیڑ کے پچھتائے یہ
خیمۂ شاہ سے گھبرا کے نکل آئے یہ

عرض کی خدمت حضرت میں کہ اے نور خدا
مل گئی آپ کے اقبال سے مرنے کی رضا
اب کسی قسم کی تاخیر نہیں ہے زیبا
شہؑ نے فرمایا کہ کیا بس ہے سدھارو بیٹا
رُک گئی چل کے ہوا تیر نفس آ پہنچا
یوں مژہ کو ہوئی جنبش کہ فرس آ پہنچا

رخش آیا جو بصد سطوت و توقیر و وقار
راکب دوش نبیؐ کا ہوا فرزند سوار
ہوگیا اور کنوتی کو بدل کر رہوار
حسن کی شاخ میں دو کوپلیں پھوٹیں اکبار
دل کو کرتے ہیں خبر بے خبری کے جھونکے
تھے نفس یا کہ نسیم سحری کے جھونکے

دو قدم چل کے ذرا تھم گیا ان کا رہوار
کہا عمو کے غم ہجر سے سینہ ہے فگار
وہ کٹے ہاتھ کدھر ہیں کہ نہیں دل کو قرار
دے دیئے شہؑ نے جو وہ ہاتھ تو رویا جرّار
آہ تاثیر میں ڈوبی ہوئی اک بھر کے چلے
اپنی تلوار کو ان ہاتھوں سے مس کرکے چلے

گرد کہتی ہے کہ لڑنے میں نہیں ہے کوئی دیر
ایک مدت سے طبیعت ہوئی جینے سے بھی سیر
کھنچ کے اب داخل قسمت ہوا ہے راہ کا پھیر
اسد اللہ کا پوتا ہے یہ ہے شیروں کا شیر
نعمت زیست کو ہر ایک جری ترسے گا
آج تلوار کے پانی سے لہو برسے گا

رخش پر جلوہ فگن آپ ہیں مثل حیدرؑ
خود بخود آج کھلا جاتا ہے باب خیبر
ڈر بڑھا ہے کہ ہٹا جاتا ہے پیچھے لشکر
سُرخ چہرہ ہے، شجاعت کا ہے اک یہ بھی اثر
جھک کے اب سیر کرے چرخ کہن ماتھے کی
خون کی ڈوبی چھری ہے کہ شکن ماتھے کی

رخش شرما کے نہ دکھلائے پری کی رفتار
ایک کو بھائے نہ درد جگری کی رفتار
ٹھوکریں کھائے ابھی کبکِ دری کی رفتار
سرد ہوجائے نسیم سحری کی رفتار
ہے یہ دلسوز کہ بجلی کو بھی تڑپا کے چلے
آگ لگ جائے زمانے میں جو گرما کے چلے

ہر بلا آئی ہوئی کہتی ہے ٹالو مجھ کو
دل بیتاب کی خواہش کہ سنبھالو مجھ کو
موت کا ہے یہ اشارہ کہ بلا لو مجھ کو
خون کہتا ہے رگوں سے کہ نکالو مجھ کو
دل میں پارے کے تمنا ہے کہ جلدی کھو جاؤں
درد دل کروٹیں لیتا ہے کہ رخصت ہوجاؤں

یال اُڑنے میں بنی زلف گرہ گیر فرس
چین پیشانیِ راکب ہے کہ زنجیر فرس
آگے تقدیر کے چلنے لگی تدبیر فرس
برق تابندہ ہے یا کوکب تقدیر فرس
روشنی چہرۂ روشن کی یہ نورانی ہے
خط تقدیر کے پڑھ لینے میں آسانی ہے

اہل عالم سے ہے وصل اہل فلک سے ہے فراق
کیوں نہ ان سب کے دلوں پر غم دوری رہے شاق
کون تھا وہ جو نہ تھا چال کا اس کی مشتاق
یہ ہیں تصویر نبیؐ رخش ہے تصویر بُراق
راہ کے پھیر کا ہو ذکر یہ منظور نہیں!
اب خدا تک یہی لے جائے تو کچھ دور نہیں

غل یہ لشکر میں اٹھا ہے کہ نہیں جائے قرار
پھر کے دیکھو نہ ادھر اور بھگاؤ رہوار
دل کے مانند لرز جائے گا خیبر کا حصار
بعد مدت کے قیامت کی چلے گی تلوار
یہ پسینے سے کھنچا اور نہ پانی سے کھنچا
چلوؤں خون علیؑ اس کی جوانی سے کھنچا

شیر نے شیر کا پایا صف ہیجا سے خطاب
کربلا والوں میں مشہور انھیں کا ہے شباب
شب معراج کا ایسا ہے یہ ظاہر کا حجاب
سب پیمبر ابھی کہتے ہیں اُلٹ دیں جو نقاب
چشم و ابرو میں نہ فرق اور نہ کمی دیکھتے ہیں
آسماں والے بھی تصویر نبیؐ دیکھتے ہیں

اس میں کیا شک کہ اصالت میں یہ تلوار ہے خوب
سر جھکانے کا پسند آگیا اس کو اسلوب
دیکھ کر اس کی چمک حد کا ہوا ہے محجوب
مہر کیونکر نہ ہو اک قطرۂ خوں بن کے غروب
گردشیں کرنے میں عمر اس کی بسر ہوتی ہے
شام مغرب میں تو مشرق میں سحر ہوتی ہے

ایک کو ایک کی ہر طرح سے لازم ہے خبر
دو طرف ایک سا ہوتا ہے محبت کا اثر
میان سے تیغ اسی شوق میں نکلی باہر
کہ پڑے میری بھی حسن علی اکبرؑ پہ نظر
کچھ عجب شان سے وہ صاعقہ کردار کھنچی
یوں شکن پڑ گئی ماتھے پہ کہ تلوار کھنچی

موت کا کھنچ گیا نقشہ جو چلی تیغ دو دم
کٹ کے گرنے لگے ہاتھ ان کے ہوئے سر جو قلم
اس میں الٹی ہے صفت غیظ سوا رحم ہے کم
دم نہ لے اس کو شباب علی اکبرؑ کی قسم
جان لے لینے کا یہ پا کے محل کھنچتی ہے
اسی آئینے سے تصویر اجل کھنچتی ہے

کر چکی سب کے مکانوں کی تباہی تلوار
فخر ہو، پائیں اگر ایسی سپاہی تلوار
کیوں نہ دے رنگ بدلنے پہ گواہی تلوار
سرخ ہوتی ہے کبھی اور کبھی کاہی تلوار
لے کے پہلوئے حقیقت کو فسانہ بدلا
رنگ لوہے کا یہ بدلا کہ زمانہ بدلا

حسرتیں نکلی ہیں خود چھوڑ کے غم خانۂ دل
اب تو ویران رہے گا یونہی کاشانۂ دل
خاک میں مل گئی سب ہمتِ مردانۂ دل
اپنے سناٹے کو دکھلاتا ہے ویرانۂ دل
ہو چکا دل کا لہو روح خبر پانے لگی!
اب تو انگڑائیوں میں خون کی بو آنے لگی!

تفرقہ دیکھئے تو تن ہیں الگ سر ہیں الگ
روحیں مدت سے مکیں جن میں تھیں وہ گھر ہیں الگ
خون جو دل کا کئے دیتے ہیں وہ ڈر ہیں الگ
تفرقہ دیکھئے تو تیر الگ پر ہیں الگ
سب اداؤں میں ادا ہوش ربا کون سی ہے
جس میں پر اڑتے ہیں آخر وہ ہوا کون سی ہے

تیغ کو آگ لگانے کے سوا کام نہیں
بے ستائے کسی دل کے اسے آرام نہیں
اب جلاکر بھی کرے خاک تو الزام نہیں
زخم دل سیکڑوں باتوں میں کوئی نام نہیں
ناز سے کہتی ہے انجام بتا دوں گی تمہیں
سو رہو آج قیامت میں جگا دوں گی تمہیں

چھوڑ کر پہلوئے گل باغ کی بو کیا ٹھہرے
ڈر سے ہر ایک دلِ عربدہ جو کیا ٹھہرے
بھاگنے کی جسے برسوں سے ہو خو کیا ٹھہرے
تن بسمل کو جو چھوڑے وہ لہو کیا ٹھہرے
پیدلوں کی تھیں جو آگے وہ قطاریں بھاگیں
چھوڑ کر زخمیوں کو خون کی دھاریں بھاگیں

روشنی آنکھوں میں رہ جائے بہت ہے دشوار
گرد ہے شیشۂ ساعت کی کہ عالم کا غبار
دشت ڈھالوں کی سیاہی سے بنا ہے شب تار
راہ گرنے کی نہ بجلی کو بھی سوجھی زنہار
برق وہ سوز محبت کی بنا کر آئی
رات اندھیری تھی تو مشعل کو جلا کر آئی

ہاں کدھر تو ہے طبیعت ہے مکدر ساقی
مئے دو آتشہ دے جام میں بھر کر ساقی
تجھ سے خوبی میں نہیں کوئی بھی بہتر ساقی
اے زہے رتبہ کہ ہم شان پیمبرؐ ساقی
خلد ملتا نہیں جس کو اسے کیا ملتا ہے
تجھ سے ملنے پہ سنا ہے کہ خدا ملتا ہے

میکدے میں بھی تکلف نہیں کم گھر کی طرح
غنچۂ دل بھی شگفتہ ہو گلِ تر کی طرح
مست کی چشم بھی گردش میں ہے ساغر کی طرح
نشہ بھی گھٹ کے بڑھا جاتا ہے کوثر کی طرح
سرخ شیشہ ہے کوئی اور کوئی دھانی ہے
کیا دو رنگی ہے کہیں آگ کہیں پانی ہے

کوئی چرچا نہیں کچھ نام نہیں دھوم نہیں
دفتر میکدہ میں نام بھی مرقوم نہیں
جیسے میکش کی کسی بات کا مفہوم نہیں
ابھی پینے کا طریقہ مجھے معلوم نہیں
حرف آتا ہے کسی مست کے افسانے پر
کیوں نہ جلدی پیوں اک بوجھ ہے پیمانے پر

ہٹتے ہی دامن ساقی کے وہ چھلکا ساغر
دو ملیں آج کا ایک، ایک ہو کل کا ساغر
پھول سی شے ہو تو کیونکر نہ ہو ہلکا ساغر
وہ گرے اشک مرے دیکھ وہ چھلکا ساغر
کیا میں کوسوں کہ نہ مرتی ہے نہ یہ جیتی ہے
میرے حصے کی جو مے ہے وہ زمیں پیتی ہے

داغ بے حد ہیں تو ہے دل کا بہلنا دشوار
اب فلک پر بھی پہنچتا ہے دماغ میخوار
تھا نہ داغوں کا شمار اور نہ ان سب کا شمار
شب کے پردے ہی میں ہاتھ آگئے جگنو دو چار
بند کر لیتا ہوں مٹھی کو بہت پیارے ہیں
یہ بتا دو کہ مرے ہاتھ میں گے تارے ہیں

سب کو کیا کیا نہیں مل جاتا ہے تیرے در سے
حد بھی ہوتی ہے کہاں تک کوئی آخر تر سے
پھر گھٹا اٹھتی ہے محروم نہ رکھ ساغر سے
چاہتا ہوں کہ یہی ابر ہمیشہ برسے
پانی برسے تو ہوں سرسبز چمن کے کانٹے
دل میں ایسا نہ ہو چبھ جائیں دہن کے کانٹے

جس کو مانے ہیں سلاطیں وہ اسے شان ملے
اب تو ہر لحظہ ملے اور مجھے ہر آن ملے
راستے میں کوئی منزل نہ پریشان ملے
پھر دوبارہ تنِ مردہ کو مرے جان ملے
اس کو مے دیتا ہے یہ جس کو خدا دیتا ہے
یہی ساقی مرا مُردوں کو جلا دیتا ہے

کس کی قوت تھی کہ پیمانوں میں دریا رہے بند
آسماں سے بھی زیادہ ہے مکاں کس کا بلند
ڈوب کر مہر پھرا اس سے کہ تھا حاجت مند
کس کا گھر آ گیا ٹھہرے ہوئے تارے کو پسند
ہو مزا اور اگر یہ سحر و شام ملیں
مجھ کو بھی آج چمکتے ہوئے دو جام ملیں

اے اماموں کے پدر جلد بنا دے مرے کام
تیرے فرزند کے مداحوں میں میرا بھی ہو نام
میں تڑپ کر یہی کہتا ہوں کہ ہونے کو ہے شام
میں نے مانا کہ گرانقدر بھی بھاری بھی ہے جام
شوق بڑھنے لگا درد دل مضطر کی طرح
جام ہے جام اُٹھالے در خیبر کی طرح

کوئی بگڑے کہ بنے اس سے بھی ہم کو نہیں کام
نشہ میں رہ کے بھی اچھا ہے ہمارا انجام
انگلیاں پانچ ہیں اور ایک ہتھیلی پہ ہے جام
پنجتن کی نہ محبت ہو تو پینا ہے حرام
اسی ساقی کو نہ جانے کہ یہ کیا کہتے ہیں
نشہ جن کا نہیں اُترا وہ خدا کہتے ہیں

کوئی الزام کسی کو نہ دیا تھا میں نے
امتحاں دل کی محبت کا لیا تھا میں نے
چھپ کے اُلفت کا نہیں جام پیا تھا میں نے
در خیبر کا ابھی نام لیا تھا میں نے
کیوں نہ دہشت ہو جو شیر صف ہیجا پہنچے
آستینوں کو چڑھا کر وہ علیؑ آ پہنچے

گھر میں خالق کے اذاں کس نے دی حیدرؑ کی طرح
گھر پہ مسجد کے بھی قبضہ رہا خیبر کی طرح
آنکھیں کعبہ بھی بچھائے رہا بستر کی طرح
باپ کا ان کے یہ دریا بھی ہے کوثر کی طرح
حق کسی اور طرف ہے یہ تمہیں دھوکا ہے
یہ وہی آب رواں ہے کہ جسے روکا ہے

جنگ عباسؑ میں تھا باڑھ پہ خوں کا دریا
توبہ وہ جنگ تھی کم یہ نہیں مطلب میرا
پانی لینا تھا انھیں آئے ہیں یہ بہر و غا
وہ کمر تک تھا یہ سینے سے ہے دریا اونچا
اب تلک فرق نہیں زور میں طغیانی میں
غرق ہیں مچھلیاں بازو کی اسی پانی میں

غل یہ برپا ہے کہ افسر کو نہ کیوں ہوش آئے
سب یونہی دیکھنے کو لے کے تن و توش آئے
ساکن شہر خموشاں تھے کہ خاموش آئے
کیا ہو اس خون کے دریا میں اگر جوش آئے
کوئی پٹکا تھا کمر سے جو لپیٹا نہ گیا
ایک دامن بھی شفق سے تو سمیٹا نہ گیا

خوں کو رگ رگ میں چھپا دیتا ہے بڑھتا ہوا ڈر
دل جو غافل ہے تو کہتا بھی نہیں ہائے جگر
تفرقہ یہ ہے کہ ہیں پاؤں کہیں اور کہیں سر
ہیں تو دو ہاتھ مگر ایک ادھر ایک اُدھر
بہ فراغت رہیں اس کا بھی زمانہ نہ رہا
دشت میں روحوں کے رہنے کا ٹھکانہ نہ رہا

رن میں کیا تیغ تھی جو لاکھوں کے سر کاٹ گئی
لے چلی سیر عدم کو جو کمر کاٹ گئی
جب پھری آنکھ میں پتلی کی سپر کاٹ گئی
حد سے کچھ بڑھنے میں جبریلؑ کے پر کاٹ گئی
چل کے صحرا کے گڑھے پاٹ چکی ہے تلوار
سن کے اٹھارہ برس کاٹ چکی ہے تلوار

شاہ دیں بڑھ کے یہ کہتے ہیں کہ سن لو دلبر
یوں لڑے پیاس میں تم جیسے لڑے تھے حیدرؑ
امتِ جد ہے یہ، کیا تم کو نہیں اس کی خبر
اب شہادت کے بھی دکھلا دو سبھوں کو جوہر
رحم لازم ہے مصیبت کے گرفتاروں پر
رہ گیا ان کا لہو آج سے تلواروں پر

مطمئن کیوں نہ ہو انجام سے قلبِ ناشاد
شکر صد شکر کہ ہر طرح سے بر آئی مراد
بعد عباسؑ کے رہ جائے گی یہ جنگ بھی یاد
وہ علیؑ کی تھی لڑائی یہ پیمبرؐ کا جہاد
دامن اہل جہاں آنسوؤں سے نم بھی نہ تھا
تم مشابہ تھے نبیؐ سے یہ شرف کم بھی نہ تھا

سن کے یہ شاد ہوا قلبِ حزین و مضطر
تن کے خود اپنی جوانی پہ کی صفدر نے نظر
میان میں تیغ رکھی حال جو تھا نوعِ دگر
جھک کے تسلیم بجا لائے تو روئے سرورؐ
جتنی جلدی میں بنیں اتنی دعائیں لے لیں
پس پردہ سے ادھر ماں نے بلائیں لے لیں

دیر تک یہ جو رہے دھوپ میں سرگرم وغا
ہاتھ سے باگ چھٹی درد کلیجے میں ہوا
ہوتی ہے فصل جوانی میں عطش اور سوا
مختصر تو ہے یہی ضعف بڑھا زور گھٹا
نہ شقاوت نہ کسی بے ادبی نے مارا
ان کو مارا تو فقط تشنہ لبی نے مارا

لڑتے لڑتے یہ گئے پیش شہنشاہ زمن
تر پسینے میں گریباں کی طرح تھے دامن
وہ تمازت وہ شباب اور وہ دھوپ اور وہ بن
گرم لوہا تھا زرہ کا کہ جلا جاتا تھا تن
کئی بار آب دم تشنہ دہانی مانگا
آپ رونے لگے، اکبرؑ نے جو پانی مانگا

کہا حضرت نے کہ صدقے تری جرأت کے پدر
زور کچھ بھی نہیں ہر طرح ہے مجبور بشر
جاؤ پھر جنگ کو تدبیر یہی ہے بہتر
پھنک رہا ہے علی اصغرؑ کا بھی ننھا سا جگر
دیکھا جاتا نہیں بچوں کا بلکنا بیٹا
جو بچے اس سے زرہ پر وہ چھڑکنا بیٹا

حسبِ ارشاد پدر رن میں گیا پھر صفدر
برچھیاں پڑنے سے مجروح ہوئے قلب و جگر
گرد تلواریں لیے آگئے تھے بانیٔ شر
کیا کرے کیا نہ کرے ایک غریب و مضطر
کھائی دنیا کی ہوا اور کو ایذا دے کر
گرسناں سینے سے نکلی تو کلیجا لے کر

پیاس میں سانس کی بھی آمد و شد اب ہے محال
برچھی پڑ جانے سے اب غیر ہوا شیر کا حال
اس طرف ہوگئے آگاہ شہ نیک خصال
یہ بھی کہتے تھے کہ اب آگیا آنکھوں پہ زوال
کوئی کیا جانے کہ ارمان بھی دل کے کیا ہیں
ٹھوکریں کھائیں گے مقتل میں کہ ہم تنہا ہیں

نہ ٹھہرنے کا فرس پر بھی رہا جب یارا
گر پڑا عرش الٰہی کا زمیں پر تارا
موت آجائے جو ان کی تو نہیں کچھ چارا
باپ کا قلب شکستہ ہوا پارہ پارہ
ایسی تصویر کسی وقت کی بے چین نہ تھی
میں نہیں، کہتا ہے دل، پاؤں میں نعلین نہ تھی

رو کے فرماتے تھے بیٹا نہ کوئی بھائی ہے
نہ بصارت ہے نہ اب دل میں توانائی ہے
برچھی سینہ پہ مرے لال کہاں کھائی ہے
بیکسی روتی ہے خود جس پہ وہ تنہائی ہے
کیا کریں کچھ نہیں آنکھوں سے نظر آتا ہے
علی اکبرؑ ترے لاشے پہ پدر آتا ہے

لاش فرزند پہ پہنچے ہیں شہ جن و بشر
پوچھا بیٹے سے کہ کیا حال ہے اے نور نظر
نہیں معلوم کہ کیا بن گئی شہ کے دل پر
علی اکبرؑ نے کہا تھا کہ ہوں میں تشنہ جگر
ہے یہ حسرت کہ دم تشنہ دہانی دیجے
مجھ کو مشکیزۂ عباسؑ کا پانی دیجے

ننگے سر حضرت زینبؑ نکل آئی ہیں اُدھر
کہتی ہیں کون سی بدلی میں چھپا ہے وہ قمر
یہیں مرجاؤں گی اب پیٹ کے میں سینہ و سر
میرے اٹھارہ برس والے کی ہے لاش کدھر
شاہ کچھ زیر لب آہستہ دعا پڑھتے ہیں
کانپتے ہاتھ سناں کھینچنے کو بڑھتے ہیں

رو کے کہتے ہیں کہ اب کیا کرے غربت میں پدر
پیاسے دنیا سے سدھارے سوئے جنت اکبرؑ
اب زباں روک لے جاویدؔ یہی ہے بہتر
کر دعا حق سے کہ مجبور ہے ہر طرح بشر
کیا کوئی اور ہے جو اس کے سوا رحم کرے
مجھ پہ اکبرؑ کے تصدق میں خدا رحم کرے

❁❁❁